ایم ڈبلیو گندر۔لیکچرار فیڈرل کالج۔برٹو روڈ کراچی

خلیفہ کے تعلقات مسلمانوں سے

علاّمہ ماوردی کے نظریہ دوطرفہ عقد کی روشنی میں

دوطرفہ عقد کی اصطلاح اگرچہ علاّمہ ماوردی نے استعمال نہیں کی ہے لیکن عقد و معاہدہ کی جو شکل اس نے اپنی کتاب "الاحکام السلطانیہ" میں بیان کی ہے۔اس کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے خدابخش بہاری نے یہ اصطلاح اپنی کتاب (POLITIES IN ISLAM) میں استعمال کی ہے۔علم السیاسیات میں یہ اصطلاح تشریح طلب ہے۔

بقول گلگرائسٹ:۔ "دراصل دو آدمیوں کے باہمی معاملہ کو عقد کہتے ہیں جس کی وجہ سے ان دونوں پر کچھ فرائض اور حقوق عاید ہوتے ہیں۔اور ایک خاص نصب العین کے تحت ان کی راہ عمل اور باہمی طریق کار متعین ہوجاتا ہے۔اس صورت میں ظاہر ہے کہ جب ایک فریق اس باہمی معاہدہ یا عقد کی خلاف ورزی کرے گا یا اس شرائط کو پورا نہ کرے گا تو وہ عہد خود بخود ٹوٹ جائے گا۔اور یہ دونوں فریق ان مذکورہ شرائط اور باہمی حقوق و فرائض سے بری الذمہ ہوجائیں گے

(PRINCIPAL of POLITICAL SCIRNCE)

یونانی مفکرین میں بھی ہمیں حکومات کے نظریے ملتے ہیں۔مگر ان کے نظریات اس قدر جانبدار اور ترجیحانہ ہیں کہ انھوں نے نامنصفانہ اور ظالمانہ صورت اختیار کر لی ہے۔بلنچلی

کہتا ہے کہ "یونانی سلطنت کو خود سلطنت کی غرض وغایت تصور کرتے تھے۔ سلطنت ان کے نزدیک اصل تھی۔ اور جمہور اس کے تحت اجزاء، ہر فرد سلطنت کا خدمت گذار تھا۔ سلطنت افراد کی خدمت گذاری نہیں تھی"۔

مشہور یونانی فلسفی افلاطون معاشرہ میں مختلف طبقوں کا قائل تھا جو باہم متفاوت درجات رکھتے ہیں۔ ان میں وہ آخری طبقہ مزدوران اور غلاموں کا قرار دیتا ہے۔ اور ان محنت کش لوگوں کو چوپایوں کی طرح قرار دیتا ہے۔ اور کہتا ہے "ادنیٰ طبقہ کو اعلیٰ طبقہ کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ (REPUBLIC)

دوسری جانب یونانی فلسفی ارسطو ہے جو اونچے طبقے کے لائق وفائق اشخاص کی حکومت یعنی (ARISTOCRACY) کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی شہری کی کوئی ہستی نہیں ہے، ہر شخص سلطنت کا جزو ہے اور اس کے تابع ہے۔ گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ شہری کی اپنی کوئی انفرادیت ہے۔ اور آگے چل کر کہتا ہے کہ "رعیت زبردست غلام ہے جو انصاف کے سائے میں رہتی ہے (ARISTOTLE AND HIS PHILOSOPHY)

اقرونِ وسطیٰ میں بعض ایسے متمرد شہنشاہ گذرے ہیں۔ جنھوں نے دعویٰ کیا کہ "انھیں حکومت کرنے کا حق خدا تعالیٰ سے حاصل ہوا ہے۔ کوئی ان کو تخت سے معزول نہیں کرسکتا یہی نظریہ آگے چل کر حق نیابت الہٰی کے نام سے موسوم ہوا۔ دوسری جانب پاپا ئیت نے بھی اس آسمانی حق بادشاہت کو عرصہ دراز تک استعمال کیا۔ پاپائے روم کا بھی یہی دعویٰ تھا کہ وہ زمین پر خدا تعالیٰ کا جانشین ہے۔ اس کے حلال وحرام کا حکم صادر کرتے، لوگوں کے گناہ معاف کرنے کفارہ قبول کرنے اور سزا دینے کا حق حاصل ہے۔ اس کی آواز خدائی آواز ہے۔ وہی قانون ساز ہے اور صرف خدا تعالیٰ کے آگے جواب دہ ہے۔ یہی گویا حکومتِ الٰہیہ یعنی (THEOCRACY) تھی۔

اس کے بعد تین مشہور یوروپی مفکرین۔ ہابس، لاک، روسو نے دنیا کے سامنے یہ

نظریہ معاہدۂ عمرانی پیش کیا۔ ہابس کا نظریہ یہ تھا کہ جب خود غرضیوں کو تصادم سے لوگ عاجز آ گئے تو انھوں نے باہمی معاہدہ کر کے اپنی قوتوں کو ایک اقتدار اعلیٰ کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کا نظریہ درحقیقت ٹیوڈر بادشاہوں کی طرفداری میں تھا۔ تاکہ انھیں حق بجانب ثابت کیا جا سکے۔ اس طرح اس نے عوام اور حکومت کے معاملہ کو خلط ملط کر دیا۔ اس کے بعد لاک نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مملکت کے قیام سے پہلے کوئی قانون نہیں تھا۔ بعد ضروریات سے مجبور ہو کر لوگوں نے باہمی معاہدہ کر لیا کہ چند مطالبات سے دستبردار ہو کر مل جُل کر زندگی بسر کریں۔ اسی طرح اس نے بادشاہت کے خلاف نظریہ قائم کر کے پارلیمان (Parliament) کی تائید کی مگر اس نظریہ کے مطابق انسانی فطری حالت میں بالکل آرام سے تھا۔ لوگ آزادانہ امن کی زندگی گزارتے تھے۔ مگر لوگوں کی حرص کی وجہ سے یہ عہد زریں ختم ہو گیا۔ پھر اس نے جو حکومت کا نظریہ پیش کیا ہے وہ صرف عاملانہ اور تنقیدی اختیارات کی حامل ہے نہ کہ قانون سازی کی۔ اسی نظریہ سے متاثر ہو کر فرانس میں انقلاب برپا ہوا۔ کانٹ مشہور جرمن فلسفی کے شاگرد رشید فیشتے نے اپنے نظریہ عمرانی میں فرد کو معاشرہ اور ریاست میں بہت ہی زیادہ اہمیت دی ہے جس کی وجہ سے اسے ہر آن بغاوت و انقلاب برپا کرنے کا حق مل گیا ہے۔ ہم اگر ان مذکورہ بالا نظریات پر غور کریں تو یہ سب اپنی جگہ ناقص اور غیر متوازن نظر آئیں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام نظریات جانبدارانہ طریقہ پر وضع کیے گئے ہیں۔ وہ عوام اور حکومت میں کسی ایک فریق کے ساتھ دینا چاہتے ہیں اور اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے فرضی شکلیں قائم کرتے ہیں۔

آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ یہ صرف اسلام ہے جس نے راعی اور رعایا کے مابین مکمل توازن قائم کیا ہے اور کسی کی طرف داری نہیں کی ہے۔ اگر سیاسی اصطلاح استعمال کریں تو اس خصوصیت کو ہم ان الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں کہ اسلام نے "کلی مطلق العنانیت" اور "کلی جمہوریت عامہ" کے مابین توازن ملحوظ رکھا۔ یہ آئینی مقتدر اعلیٰ کو تسلیم کرتا ہے۔

مگر مقننہ وعاملہ کو حکومت کے امور میں کافی آزادی دیتا ہے۔ اس طرح یہ بغاوت وانقلاب اور جبری اطاعت کی درمیانی راہ اختیار کرتا ہے۔ درحقیقت اسلام کے نظریہ کی اکملیت کا راز یہ ہے کہ اس کا پیش کردہ راعی و رعایا کا باہمی معاہدہ خداتعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے اور اس کی وحی کے عین مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

"ولقد ارسلنا بالبینت وانزلنا معھم الکتٰب والمیزان لیقوم الناس بالقسط۔ (قرآن)

ان کے ہمراہ کتاب اور میزان عدل بھی اتاری تاکہ لوگ نقطۂ عدل پر قائم رہیں۔

اسلام میں راعی اور رعایا کے باہمی تعلقات اس آیت سے واضح ہیں:۔

ھو الذی جعلکم خلائف الارض و رفع بعضکم فوق بعض درجات لیبلوکم فی ما اٰتاکم (قرآن)

وہی ہے جس نے تمھیں زمین پر اپنا خلیفہ بنایا۔ اور بعض کو بعض پر بلند درجے عطا کیے تاکہ جو کچھ تمھیں عطا کیا ہے۔ اس میں تمہاری آزمائش کرے۔

مذکورہ آیت میں خلافت کا حقدار آں حضرت صلعم کے بعد امت محمدیہ کو قرار دیا ہے اور "رفع بعضکم فوق درجات"۔ نیز "فضل بعضکم علی بعض" سے ظاہر کیا گیا ہے کہ امامت و پیشوائی اور سیادت و قیادت اعلیٰ صلاحیتوں پر موقوف ہے۔

مگر دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل صلاحیت تقویٰ ہے۔ آیت "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" (قرآن)

خداتعالیٰ کے نزدیک بزرگ تر وہ ہے۔ جو زیادہ متقی ہے۔

"اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم"

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو۔ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے صاحب امر کی اطاعت کرو۔

اس قسم کی آیات میں ایک مرکزی قوت کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ بقول ٹی۔ آرنلڈ :۔

جماعت اور امام، یہ دو لفظ اسلام کے پورے سیاسی نظام کی روح ہے

اسلام کا یہ سیاسی یا حکومتی معاہدہ تین درجوں میں بیان کیا جاسکتا ہے :۔

(۱) پوری اُمت اس امر پر رضامند ہو کہ وہ اپنے حقِ خلافت کو ایک مرکزی قوت کے سپرد کر دے۔

(۲) کسی ایک شخص کو اپنا امیر یا امام بنانے پر متفق ہو جائے

(۳) اس تجویز کو قبول کرنے کے بعد ایک امام کو چُن لیں۔ تو اس کے ساتھ عقد یا عہد و پیمان کیا جائے۔

خلافتِ ارض کے حقدار بے شک تمام مسلمان ہیں مگر سب افراد بیک وقت حکومت نہیں کر سکتے۔ اس کا قابلِ عمل طریقہ یہی ہوسکتا ہے کہ وہ جماعت بن کر رہیں اور اپنی مرضی سے ایک لائق اور قابلِ اعتماد شخص کو ایسا نمائندہ یا امام چُن لیں اور اس سے معاہدہ کر کے حقوق و اختیارات کو آپس میں تقسیم کر لیں۔

دورِ اول میں یہ معاہدہ خلیفہ سے لیا جاتا تھا۔ اور دونوں جانب سے شرائط طے ہوتے تھے۔ جس کا پورا کرنا فریقِ ثانی کے ایفائے عہد پر مبنی تھا۔ امت امام یا خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے یہ عقد کرتی جس کو سب سے پہلے آنحضرت صلعم نے پیش کیا اور پھر صحابہ کرامؓ نے اس پر عمل کیا۔ بعض اوقات حلفیہ عہد بھی کافی ہوتا تھا۔

بیعت دراصل ایک آئینی عہد ہے جس کا تعلق عوام اور امام سے ہے اور جس کے بغیر ریاست عامہ کے رئیس عام کا انتخاب قانونی تقرر کی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ بیعت عملی سیاست کے دائرہ میں قطعی سند ہے جس کی رُو سے عوام امام کی نصرت و اطاعت کا عہد کرتے ہیں۔ اور امام اور عوام کے سامنے اچھے طرز پر حکومت چلانے کا وعدہ کرتا ہے۔

بیعت کے دو آئینی درجے ہیں :۔

پہلے درجے پر اسلامی ریاست کے اول درجے کے قابل اعتماد اصحاب یعنی ارباب حل و عقد بیعت کرتے ہیں۔ یہ محدود بیعت ہے مگر قانون کی نظر میں بے حد موثر سمجھی جاتی ہے۔

دوسرے درجے پر بیعت عامہ بر سر عمل آتی ہے۔ اس صورت میں عوام عہد میں پیش قدمی کرتے ہیں۔ آخر میں امام عوام کی موجودگی میں اس عہد کو مکمل کر دیتا ہے اور اس طرح یہ عہد دو طرفہ عقد بن کر ایک معاہدہ اجتماعی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ معاہدہ وجودی اور ایک محسوس شے ہے۔ بس لاک، روسو کے معاہدہ عمرانی کی طرح محض ذہنی اور تخیلی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ریاست عامہ کے عملی اور حکمت عملی سے ہے وہ ایک واقع کی طرح وجود میں آتا ہے اور فوراً اپنا اثر اجتماعی نظام پر ڈالتا ہے۔

انتخاب کے بعد خلیفہ یا امام پر کئی ذمہ داریاں اور فرائض عائد ہو جاتے ہیں۔ علامہ ماوردی نے خلیفہ کے دس فرائض بیان کیے ہیں:۔

(۱) دین اسلام کے اصول کو بلند و بالا کرنا۔

(۲) نزاعات و مقدمات کا فیصل کرنا

(۳) ممالک اسلامیہ کی حفاظت کرنا۔

(۴) حدود و سیاست و تعزیرات جاری کرنا۔

(۵) سرحدی علاقوں میں تحفظ کے لیے سامانِ حرب فراہم کرنا اور سپاہ رکھنا۔

(۶) ان لوگوں سے جہاد کرنا جو قبول اسلام سے انکار کریں۔ یا بحیثیت قومی اطاعت پر راضی ہوں۔

(۷) حسب احکام شریعت محاصل لگانا

(۸) بیت المال سے سالانہ وظیفہ تقسیم کرنا۔

(۹) مختلف اضلاع میں بندوبست محاصل و نظم و نسق ملکی کے لیے معتمد اشخاص اور مشیر مقرر کرنا۔

(۱۰) کاروبار سلطنت کی نگرانی کرنا اور بچشمِ خود حالات کی نگرانی کرنا۔

علامہ ماوردی لکھتے ہیں کہ جب امام نے مذکورہ بالا فرائض کی بجا آوری کر لی تو اب امت پر واجب ہے کہ جب تک خلیفہ کی حالت میں تغیر نہ ہو وہ اس کی اطاعت و نصرت کرے۔

گویا ان فرائض میں سے کسی کو پورا نہ کیا تو وہ عہد ٹوٹ جائے گا، جو امت سے ہوا تھا۔ اس کے آگے رقمطراز ہیں :۔

" اگر ان دونوں باتوں سے ایک بھی خلیفہ میں پیدا ہو جائے تو وہ امامت سے خارج ہو جائے گا۔ پہلی بات اس کے اخلاق (عدالت) کی خرابی، دوسرے نقص جسمانی،

عدالت میں خرابی پیدا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ فاسق ہو جائے۔ یعنی خواہشِ نفسانی کا اتباع کرے یا ممنوعات شرعیہ کا ارتکاب کرے۔ یہ ایسا فسق ہے جس کی وجہ سے کوئی شخص نہ امام بن سکتا ہے۔ جب کسی امام پر یہ حالت طاری ہو جائے گی تو وہ امامت سے خارج ہو جائے گا۔

امام راغب اصفہانی نے بھی اس نکتہ کو ایک دوسرے پیرائے میں بہت عمدہ طریقہ سے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ " جو شخص اپنی ذات کی سیاست کے لیے اہل نہیں وہ دوسروں کی سیاست کا بھی اہل نہیں ہو سکتا"

عقل بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ جس شخص کو انسانوں کے انبوہِ کثیر کے مصالح عامہ کی تکمیل کے لیے اعلیٰ ذمہ دارانہ منصب سپرد کیا جائے اس کو سب سے بہتر اور اصلح ہونا چاہیے اور جو شخص اپنے نفس پر ضبط نہیں رکھ سکتا اس سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ ریاست عامہ کے نظام کو احسن طریق سے چلا سکے۔

درحقیقت اسلام میں امام کی اطاعت محدود و مشروط ہے یعنی جب تک اس کے احکام اصولِ دین کے موافق رہیں اور قرآن و سنت کی صریح خلاف ورزی پر مبنی نہ ہوں۔ تو اس

وقت اس کے احکام کی اطاعت اور اس کے اوامر کا نفاذ ضروری ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے :-

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔

جب وہ امام ایسا حکم دے جو قرآن و سنت کی نصوص کے صریح خلاف ہو تو اس وقت اس کی اطاعت قطعی واجب نہیں۔ چنانچہ آں حضرت صلعم نے فرمایا:-

"لا طاعۃ لمخلوق لمعصیۃ الخالق (حدیث)

"یعنی نہیں اطاعت کرو مخلوق کی جس کو خالق کی معصیت ہو۔"

یہی چیز ہے جس کی طرف حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اپنے پہلے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا کہ اگر میں اچھے اصولوں پر قائم رہوں تو میری نصرت و امداد پر کمربستہ رہو۔ اور اگر برا طرزِ عمل اختیار کروں تو مجھے سیدھا کردو۔ اگر میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلعم کی اطاعت کروں، تو تم میری اطاعت کرو۔ اور اگر ایسا نہ کروں تو تم میری ہدایات کی تعمیل سے انکار کر سکتے ہو۔[1]

یہ تھے امارت و اطاعت کے زریں اصول جن کی تعلیم حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم نے اپنے عہدِ خلافت میں روزِ اول سے امت کو دینا شروع کر دیا تھا۔ آں حضرت صلعم نے اور آپ کے خلفائے راشدین اپنے مطلق العنان اختیارات کا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ ٹی آرنلڈ نے جو مطلق العنان خلافت کا نظریہ پیش کیا ہے وہ غلط تاویل کا نتیجہ ہے اس نے یا تو بیعت کے الفاظ کو غلط تعبیر کیا ہے یا بنو امیہ اور بنو عباس وغیرہ کی خلافت کو پیش نظر رکھا ہے۔

اسلام میں خلیفہ حاکم نہیں ہوتا، بلکہ خدا کی طرف سے ایک محاسب اور نگران کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے سب انسان برابر ہیں۔ کسی انسان کو دوسرے انسان پر

---

[1] (صدیق اکبر۔ سعید اکبرآبادی)

حکومت کرنے کا حق حاصل ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ کو اسلامی تعلیمات کے مطابق دوسرے مسلمانوں پر کوئی ترجیحی درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ اور نہ اس کو اختیارات ہیں کہ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر و اعلیٰ تصور کرے۔ بلکہ حریت فکر اور حقوق شہریت کے لحاظ سے وہ ایک عام شہری کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا:-

"میں بھی تمہاری طرح ایک رائے رکھتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میری رائے اور خواہش کی پیروی کرو۔"[۵]

درحقیقت خلیفہ حاکم نہیں ہوتا۔ بلکہ نائب اور امین کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے اور جن احکام کو وہ دوسروں پر نافذ کرتا ہے خود بھی ان کا اسی طرح پابند ہوتا ہے۔ وہ نہ مطلق العنان و آمر مطلق ہوتا ہے اور نہ اس کی زبان قانون ہوتی ہے۔ بلکہ اگر وہ خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے رستے سے ہٹ جائے تو امت کو حق حاصل ہے کہ اس کو سیدھے راستے پر لائے۔ وہ خدا تعالیٰ کے قوانین میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کر سکتا۔ البتہ اسلامی تعلیمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جزوی قوانین بنانے کا حق اسے حاصل ہے۔ مگر ان تمام امور میں بھی وہ امت سے مشورہ لینے کا پابند ہے۔

اس کے علاوہ خلیفہ اسلامی ریاست کے تمام امور میں اللہ تعالیٰ اور امتِ مسلمہ کے آگے جواب دہ ہے اور اسی وقت تک مسندِ قیادت پر فائز رہ سکتا ہے۔ جب تک کہ اس کو امت کا اعتماد حاصل ہے کہ وہ اس کو معزول کر دے یا اسے راہ راست پر لائے۔ جیسا کہ خلیفہ اول و خلیفہ ثانی کے اول خطبات سے ظاہر ہے۔

آج کل کے بہت سے جمہوری ممالک میں نمائندگان کا انتخاب ایک معین مدت کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس مدت سے قبل ان کی معزولی کا کسی کو اختیار نہیں ہوتا یعنی انتخاب کے بعد ان کو مجبور محض عضوِ معطل بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اگر عوام کا نمائندہ انتخاب کے بعد

ان کی خواہشات کا احترام نہ کرے ۔ اور حکومت کی گدی پر بیٹھتے ہی اس کا رخ بدل جائے ۔ اور اس کے عوام کا اعتماد حاصل نہ رہے تو پھر بھی وہ اس جمہوریت کے طفیل ایک طویل مُدت کے لیے لوگوں کی گردنوں پر مسلط رہے گا ۔

لیکن اسلام میں امارت و خلافت کی لازمی شرط اتباع شریعت ہے اور اسی ذریعہ سے وہ عوام کا اعتماد حاصل کرسکتا ہے ۔ اسلام میں امتیاز و ترجیح کا سبب علم و عمل اور کتاب و سنت کا اتباع کامل ہے ۔ اگر یہ نہیں تو اس پر اعتماد بھی نہیں ۔ اس لیے اگر کوئی شخص امارت و خلافت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد اسلام کے طریقے سے انحراف کرتا ہے اور امور دینی کے انتظام و انصرام میں کوتاہی کرتا ہے اور حکومت اسلامیہ کے بنیادی مقاصد کو پورا نہیں کرتے تو امت کو اس کے معزول کرنے کا حق حاصل ہے ۔ اس سلسلے میں حضرت معاذ بن جبل رضؓ کے وہ الفاظ کافی ہوں گے جو انھوں نے دربار روم میں تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمائے تھے کہ :۔

"ہمارا امیر ہماری طرح کا ایک آدمی ہوتا ہے ۔ اگر وہ ہم میں کتاب و سنت کے مطابق عمل کرے تو اس کو ہم مسندِ خلافت پر برقرار رکھتے ہیں ۔ ورنہ معزول کر دیتے ہیں"۔[۱]

چونکہ ریاست کے عوام ایک آئینی معاہدہ اور دو طرفہ عقد یعنی بیعت کے ذریعہ اپنے اختیارات خلیفہ کی ذات میں مرکوز کر دیتے ہیں ۔ لہٰذا خلیفہ آئینی حیثیت سے پوری امت کا نمائندہ ہوتا ہے ۔ اور جب تک وہ حدودِ شریعت اور عوام کے جائز مطالبات کا احترام کرتا ہے اس وقت تک وہ واجب الاطاعت ہے اور پوری امت کی آئینی قوت کا حامل ہے ۔ ورنہ بصورت دیگر عوام کو حق پہنچتا ہے کہ اس کو ہٹا کر امت میں سے کسی دوسرے اہل شخص کو اس منصب کے لیے منتخب کرلیں ۔ علامہ ماوردی نے جو یہ کہا کہ :۔

۱۔ فتوح الشام

"اہل حل و عقد کسی ایک امام کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بعد تاوقتیکہ اس کے حال میں کوئی تغیر نہ ہو جائے اسے معزول نہیں کر سکتے۔" اس کا یہی مطلب ہے"۔ قاضی عضدالدین نے اس مسئلہ کو بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے فرماتے ہیں:۔

"قوم کو حق حاصل ہے کہ کسی سبب سے خلیفہ معزول کر دے۔ جبکہ مسلمانوں کے انتظامی معاملات اور امورِ دین کی تدابیر اس کے باعث خلل پذیر ہو جائیں جس طرح قوم کو ریاست کے انتظام اور ترقی کے لیے خلیفہ کا تقرر اور انتخاب کا حق بھی حاصل ہے۔" [۱]

علامہ ماوردی اور دیگر علمائے اسلام نے اس حکومتی معاہدہ کو بقول روزنتھال ان معنوں میں استعمال کیا ہے کہ :۔

"اسلام کے احکام و قوانین اور ملک کے تاریخی و سیاسی حالات و واقعات میں مکمل ہم آہنگی پیدا کی جائے۔"

(MUSLIM POLITICAL in MIDDLE AGE)

اسلام کا پیش کردہ نظریۂ معاہدہ باہمی خیالی یا تصوّراتی نہیں۔ بلکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے بعد کے امراء و خلفاء کی غلط تاویلات سے اگرچہ خلافت جو اصلیت سے نام نہاد تھی۔ کچھ مدّت باقی رہی اور انھوں نے لوگوں کے ذہن سے قرآن شریف کے اصل نظریئے عقد کو محو کر دیا جو امّت اور خلیفہ کے رشتے کو بیان کرتا ہے۔ اور جسے علّامہ ماوردی نے دو طرفہ عقد کی حیثیت دی ہے۔ مگر قرآن و سنت میں اب بھی یہ نظریہ اپنے حقیقی رنگ و رُوپ اور اصل خدوخال میں موجود ہے اور خلافتِ راشدہ کا دَور اس کے قابلِ عمل واضح شہادت ہے۔

---

[۱] مواقف شرح مواقف